ابلاغ عامہ اور چھاپہ خانہ کا ابتدائی دور

ثنا ہارون، لیکچرار، ماس کمیونیکشن، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract

In ancient period knowledge had its limitation. It was confined in most cases within limited boundries.With the invent of printing press thoughts have travelled rapidly the world over. Printed books, news papers, perodicals and journals containing matter belong to sciences, social sciences and arts have played a vital role as far as spread of knowledge is concerned. By analysing the nature of knowledge accumulated about the Eastern world by the western scolars Edward Saeed has reached to the conclusion that orientalists have created a psudo gap between the conciousness of East and the West. He was of the opinion that the western media could not present true and original pictures of the Eastern World. So Western scholars have used their press largely for misguiding the people of East and West.

ابلاغیاتی مطالعے جہاں ابلاغ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں مختلف النوع اور رنگا رنگ رشتوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کی فضا کو بھی جنم دیتے ہیں۔ نئے دور میں یہ مطالعے نفسیات، سیاسیات اور عمرانیات کی حدود میں بھی شامل ہو چکے ہیں۔ ان میں دو افراد، خاندان، اداروں، گروہوں، قوموں، قومیتوں اور ملکوں کے مابین ابلاغ کے مطالعے کیے جاتے ہیں۔ ابلاغ عامہ کے لیے زبانوں کی ضرورت پیش آتی ہے یوں ابلاغیاتی مطالعوں کا تعلق لسانیات سے بھی جڑ جاتا ہے کہ لسانیات کسی قوم یا بولی کی مخصوص علامتوں کا مطالعہ بھی کرتی۔ ابلاغیاتی مطالعوں میں افراد اور قوموں کے رجحانات، پیغامات اور فکری زاویوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ قدیم زمانوں میں شاعری بھی ابلاغ عامہ کے ایک ذریعے کے طور پر بروئے کار لائی جاتی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری میں موجود مختلف النوع سماجی پیغامات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ پولیٹیکل امور میں شاعری سے کیا کام لیے جاتے تھے۔ یوں بھی ابلاغ عامہ کے موثر ترین ذریعے کے بطور پرانے زمانے میں شعر و ادب کا کردار کسی سے مخفی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں انسان نے اپنے جذبات، افکار اور احساسات کا ابلاغ لوک رقص، عوامی موسیقی، گیتوں، داستانوں اور کہانیوں میں بھی کیا ہے۔ ان فنون کے ارتقا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر زمانے کے انسان نے اپنے زمانے تک پہنچنے والے شعور کے مطابق انسانوں سے ابلاغ کیا ہے۔ ان کے وسیلے سے انسانی فکر کے ارتقائی مدارج کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔

آج جب دُنیا ''عالمی گاؤں'' بنتی جا رہی ہے۔انٹرنیٹ، موبائل فونز، ریڈیو، ٹیلی ویژن،فلم، کیمرہ، کتب، اخبارات، رسایل و جرائد، تیز رفتار سواریاں، ویڈیو اور آڈیو کیسٹ اور کئی دوسرے ذرائع ابلاغ نے خبروں اور معلومات کو سرعت رفتاری سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا شروع کر رکھا ہے۔مغلیہ عہد زوال یعنی اٹھارویں اور انیسویں صدی کے وسط تک ذرائع ابلاغ اور رسل و رسائل کی یہ صورت حال کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔لوگ صدیوں پرانے ابلاغی ذرائع کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کے عادی تھے۔

قدیم انسان نے اپنے شعور کو تصویروں یا تصویری لفظوں کے ذریعے پتھروں یا مٹی کی ٹیبلٹس (تختیوں) پر منتقل کیا۔لکھنے کے لیے جانوروں کی خشک کھالوں کو بھی استعمال کیا گیا۔کئی مذاہب میں غاروں میں مجسمے اور تصویریں بنائی گئیں۔ قدیم ہندوستان میں اجنتا اور ایلورا کے غار اس حوالے سے اہم ہیں۔مصر میں پیپرس کے پودے کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔پیپر کا لفظ پیپرس ہی سے متعلق ہے۔چینیوں نے سب سے پہلے کاغذ ایجاد کیا۔جب کاغذ ایجاد ہو گیا تو سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہونے والے علوم وفنون مخطوطوں کی صورت سامنے آنے لگے۔ذرائع ابلاغ یا میڈیا سٹڈیز کی تاریخ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ جب مصری تہذیب میں بادشاہت کے خاتمے کے بعد جمہوریت کا پودا پروان چڑھا تو اس زمانے میں لوگوں نے لکھنے کے لیے پیپرس (papyrus) استعمال کرنا شروع کیا۔پتھر کہ جنہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانا مشکل اور بعض صورتوں میں تو ناممکن تھا علم کے پھیلاؤ کے لیے زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔پیپرس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا آسان تھا۔پتھروں پر تصویروں اور لفظوں کو تراشنا یا کنداں کرنا وقت طلب کام تھا۔پیپرس پر قلموں کی مدد سے آسانی سے لکھا جا سکتا تھا۔یوں اس ایجاد نے پرانے زمانے میں خبر اور معلومات کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک بآسانی منتقل کرنے میں مدد کی۔پرانے زمانے میں مذہبی تعلیمات کے فروغ میں بھی پیپرس کی ایجاد نے اہم کردار ادا کیا۔اس دور میں کاتبوں کو اہمیت ملی یہ اہمیت مغرب میں ٹائپ کی ایجاد تک اور ہماری زبان میں نوری نستعلیق کی آمد تک بدستور قائم رہی۔

مسلمانوں نے عباسیوں کے دور میں یعنی آٹھویں صدی میں بغداد میں کاغذ کی صنعت کو بڑے پیمانے پر فروغ دیا اور یوں مسلم علوم وفنون تین براعظموں یعنی ایشیا، افریقہ اور یورپ تک پھیل گئے۔اس پس منظر میں کاتبوں کا معاشرے میں اہم مقام ملا۔بعد ازاں سولھویں صدی میں چھاپہ خانہ کی ایجاد نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور یوں انسان معلومات کے حصول اور ترسیل کے جدید دور میں داخل ہوا۔

(۲)

قدیم زمانوں میں شعور کی ٹھہری جھیلوں میں کبھی کبھار ہی کوئی نیا خیال یا تصور دائرے بنا کر ختم ہو جاتا تھا۔دلوں کی داستانیں اکثر دلوں ہی میں بند رہ جاتی تھیں۔ان کی باتیں ایک جگہ سے دوسرے جگہ پہنچ ہی نہیں پاتی تھیں۔بادشاہوں کے بنائے مخبری اور جاسوسی کے نظام ان تک خبریں پہنچاتے تھے۔عوام علمی طور پر ساکن معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔کاغذ کے بڑے پیمانے پر استعمال اور چھاپہ خانہ کی ایجاد نے علوم وفنون کی دُنیا میں انقلاب پیدا کیا۔

اس کے برعکس ایک نقطۂ نظر کے حامل دانشور یہ بھی کہتے ہیں کہ جب مسلم سلطنتوں پر مغربی طاقتوں کے قبضے ہو گئے تو یہ کہا جانے لگا کہ مسلمانوں کے شعر و ادب اور علوم وفنون مقصدیت کے حامل نہیں ہیں۔یوں تمام مسلم علاقوں میں ریفارمسٹ

تحریکوں کو جنم دیا گیا۔ان تحریکوں نے بھی اس امر کی نشاندہی کی کہ ہمارا قدیم شعروادب اور علوم وفنون عوام کے لیے مضراثرات کے حامل ہیں۔اُردوادب میں سرسید کی مقصدی تحریک میں انگریزی رسالوں سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کی تحریروں کو مقصدیت سے معمور سمجھا گیا۔یوں یہ بھی ہوا کہ کچھ انتہا پسند روشن خیال افراد نے سرسید سے قبل کے اُردو ادب کو مقصدیت اور حقیقت سے عاری جانا۔ اردوشعروادب کے پرانے کارنامے مسلمانوں کے عربی اور فارسی شعروادب کی توسیع کا نتیجہ تھے۔اسی علم وادب سے فیض پا کر یورپ اپنے اندھیرے زمانے سے باہر نکلا تھا اور وہاں نشاہ الثانیہ کا شور اُٹھا تھا۔تاہم زوال پذیر قوموں کو اس نوع کے صدمے تو برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔آج جب کہ ہم سرسید دور کے مقصدی ادب سے کافی دور نکل آئے ہیں اور ہمیں اُردو ادب کے پرانی دکنی، دہلوی اور لکھنوی ادبی وعلمی متون کو ازسرنو پرکھنے کے مواقع ملے ہیں تو ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہمارا پرانا ادب اپنے مروجہ سماجی اور سیاسی نظام کے مطابق حقیقت اور مقصدیت سے معمور ہے۔

دکنی دور کی نثر اور منظوم یا نثری کہانیاں بھی حقیقت سے بھرپور اور مقصدیت کی حامل ہیں۔ باغ و بہار اور فسانہ عجائب جیسی مختصر یا داستان امیرحمزہ، طلسم ہوش ربا ور بوستان خیال جیسی بڑی داستانوں میں بھی حقیقت اور صداقت کے عناصر موجود ہیں۔فرق صرف فکر اور سوچ کا ہے۔جن عقائد کو ہم توہم کہتے ہیں وہ ان داستانوں کے مصنفوں اور قاریوں کے نزدیک حقیقت تھی۔جن کہانیوں کو ہم بے مقصد خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک ایک عظیم مقصد رکھتی تھیں اور وہ مقصد تھا تفریح اور تفریح کے ذریعے اصلاح کا۔لیکن پھر بھی جس چیز کو ہم حقیقت اور مقصدیت کا نام دیتے ہیں اسے سرسید کی تحریروں سے دیکھنا شروع کرتے ہیں محض اس لیے کہ ہم اس چیز کو حقیقت ،صداقت اور مقصدیت کہتے اور سمجھتے ہیں جو روزمرہ اور عادت کے مطابق ہو اور جس میں کوئی چیز خلاف عادت اور مافوق الفطرت نہ ہو۔ زندگی جیسی کہ ہر آدمی کے سامنے ہے اس کا اظہار ہو پھر اسی کو پیش کیا جائے اور اسی کی اصلاح کی جائے۔

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کہتے ہیں کہ اُردو ادب اور تصوف کے خلاف کام کرنے والوں میں:

> ''یورپ کے عیسائی مستشرقین اور دُنیا کے مارکسی نقطہ نظر رکھنے والے مسلمان مصنفین کی تعداد زیادہ ہے جن کا مقصود ہی اسلام اور تصوف سے لوگوں کو بدظن کرنا ہے۔ ہمارے ملک میں ترقی پسند تحریک کے اجراو قیام کا مقصود سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا اور اس نے ادب وشعر کی مختلف اصناف اور صحافتی تحریروں اور مضامین کے ذریعے یہ کام بڑی شدومد سے انجام دیا ہے۔اُردو اور انگریزی میں بھی اور برصغیر کی دوسری زبانوں میں بھی۔''[۱]

قدیم ہندوستان میں علوم وفنون کی ترسیل خاص طبقے تک ہوتی تھی۔مسلمانوں کی آمد کے بعد ان کے علوم وفنون صوفیا ، درباری دانشوروں اور شاعروں کی مدد سے عام لوگوں تک پہنچے۔اور یوں ہندوستان کا منجمد معاشرہ علمی اعتبار سے متحرک ہوا۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں مختلف علوم وفنون پر لکھی گئی اپنی کتب، مختلف النوع تذکروں، تزکوں، تاریخوں، مذہبی و اخلاقی تصنیفوں (ملفوظات)، شعری تخلیقوں، ڈائریوں، خطوں کے وسیلے سے ہندوستانی عوام کی تربیت کی۔انہوں نے یہاں فارسی اور عربی علوم کے ذخیرے جمع کیے۔ مصوری، موسیقی، سنگتراشی، خطاطی وغیرہ کو بھی فروغ دیا۔ یہ وسیلے بھی عوام تک مختلف انداز سے مختلف پیغامات اور معلومات کی ترسیل کا باعث بنے۔مغلوں نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے مصور مخطوطے تیار کروائے۔ان

میں مختلف بادشاہوں کے مزاجوں اور نقطہ ہائے نظر کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں۔

> ''اٹھارہویں صدی ہجری میں جہاندار شاہ، محمد شاہ اور احمد شاہ کے دورِ حکومت میں دربار میں بڑی رندی اور سرمستی رہی۔ اس لئے اس زوال پذیر عہد کے مصوروں کی تصویریں زیادہ تر ایسی ہیں جن میں عاشقانہ، فاجرانہ اور عیاشانہ رنگ ہے۔ عورتوں اور خوابگاہوں کی تصویروں کی بڑی فراوانی ہے۔ عورتیں پتنگ اڑاتی دکھائی دیتی ہیں۔ کبوتروں کو دانے دیتی نظر آتی ہیں۔ ایک تصویر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک عاشق جانباز نے اپنی معشوقہ سے ملنے کے لئے بے تابانہ اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا ہے اور ساحل پر پہنچ کر وصل کرنا چاہتا ہے۔ پھر ایک شاہزادہ اپنی خواب گاہ میں اپنی محبوبہ سے مل رہا ہے اور کنیزیں بھی کھڑی ہیں۔ ایسی تصویریں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں نہیں بنائی گئی تھیں۔ لیکن حکومت پر زوال آ گیا تھا تو زوال پذیر سوسائٹی کے آثار ان تصویروں میں بھی نظر آنے لگے تھے۔''[۲]

برصغیر میں خبر نویسی کے آغاز و ارتقا میں پرتگالیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۵۵۰ء میں پرتگال سے طباعت کا سامان ہندوستان پہنچا۔ ۱۵۵۷ء میں پرتگالیوں نے گوا میں پرنٹنگ پریس لگایا۔ یہ مسیحی مشنریوں کے لیے لگایا گیا تھا تاکہ وہ اپنی تبلیغ کا سلسلہ بہتر طور پر جاری رکھ سکیں۔ اس پریس میں ''اصول مسیحیت'' نامی کتاب شائع ہوئی جسے کو برصغیر کی اولین مطبوعہ کتاب کہا گیا ہے۔ ۱۵۷۷ء میں ملیالم زبان میں ایک کتاب شائع کی گئی۔ مغل دور میں کتابت کو طباعت سے افضل سمجھا جاتا تھا۔ اکبر نے مطبوعہ مواد دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مغلیہ دور کے ہندوستان میں عوام کی کتابوں سے دلچسپی کم تھی۔ تاہم خطاطی کا فن اپنے عروج پر تھا۔ یہ خطاطی بادشاہوں اور امیروں کے لیے کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں اسے مذہبی ادب کے فروغ کا ذریعہ بھی بنایا گیا تھا۔ ابتدا میں یورپ میں چھاپہ خانوں نے عیسائی لٹریچر شائع کیا۔ جب یہ لٹریچر مسلمان حکمرانوں کو دکھایا جاتا تھا تو وہ یہ سوچتے تھے کہ مطبوعہ کتابیں مسلمانوں کے لیے نہیں ہیں۔ ویسے بھی ابتدا میں پرنٹنگ غیر معیاری تھی اس لیے بھی مغلوں نے فن خطاطی کو پرنٹنگ مشین پر ترجیح دی۔ برصغیر میں طباعت کا اصل سلسلہ انگریزوں کے دور میں ہی شروع ہوا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی شہروں میں پریس لگائے۔ ۱۶۷۴ء میں بمبئی میں پریس لگا۔ ۱۷۷۲ء میں مدراس میں پرنٹنگ پریس شروع کیا گیا۔ کلکتہ میں ۱۷۷۹ء میں چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ اسی سال کلکتہ سے بنگال گزٹ نکلا بعد ازاں اس کا نام ہکی گزٹ ہوا۔ یہ برصغیر ہندو پاک کا پہلا اخبار تھا۔ اس کا آغاز ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو ہوا۔ یہ جیمز آگسٹس ہکی نے شائع کروانا شروع کیا۔ یہ سب پریس انگریزی پریس تھے۔ ۱۷۸۰ء میں انڈین گزٹ چھپنا شروع ہوا۔ اس کو پیٹر ریڈر نے شروع کیا۔ مدراس کوریئر نامی اخبار ۱۷۸۵ء میں اور بمبئی ہیرلڈ ۱۷۸۹ء میں شروع ہوئے۔

۱۷۷۸ء میں ہگلی میں بنگالی ٹائپ بنوانے کا سہرا سر چارلس ولکنز کے سر ہے۔ اس ٹائپ میں بنگالی گرائمر بھی چھاپی گئی۔ بقول طارق عزیز فارسی اور عربی ٹائپ چارلس ولکنز نے تیار کروائی اور دیکھتے ہی دیکھتے انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں کلکتہ میں فارسی اور اُردو چھاپنے کے لیے چار پریس موجود تھے۔ ''ہندوستانی پریس'' فارسی رسم الخط میں میں کتب شائع ہوتی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کلکتے کی اُردو کتابیں نستعلیقی ٹائپ میں شائع ہوتی تھیں۔ ٹائپ پریسوں کے بعد لیتھو پریسوں نے طباعت کی دُنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ لیتھو طریق طباعت کا آغاز ۱۸۳۶ء میں ہوا۔ ہندوستان میں چھاپہ خانوں نے اخباروں،

رسالوں، کتابوں اور اشتہاروں کے ذریعے عوام تک سرعت سے اطلاعات پہنچانا شروع کیں۔یوں اطلاعات بہم پہنچانے کے لیے گھڑ سوار ہرکاروں اور پیدل آدمیوں کے ساتھ ساتھ ایک نئے طاقتور ذریعے کو استعمال کیا جانے لگا۔مغلیہ دور میں نقاروں، ڈھولوں یا ڈرموں کی آوازوں پر لوگوں کو جمع کر کے پیغام رسانی کی جاتی تھی۔ یوں لوگ حکومتی منشا اور فیصلوں سے آگاہ ہوتے تھے۔شیر شاہ سوری نے اطلاعات اکٹھی کرنے کے لیے جو جاسوسی نظام بنایا تھا اس سے مغلوں اور انگریزوں نے بھی استفادہ کیا۔مسلمانوں نے اموی دور میں ڈاک کا جو نظام قائم کیا تھا وہ برصغیر میں بھی ان کے کام آیا۔محکمہ ڈاک یا البرید کے ذریعے مسلم ملکوں میں خبر رسانی بہتر طریقے سے ہوئی۔محمود غزنوی کا قائم کردہ وقائع نگاری کا نظام مغلیہ دور کے عروج تک کام کرتا رہا۔ اورنگ زیب عالمگیر کا وقائع نگاری کا نظام انتہائی موثر تھا۔ یہ وقائع نگار شہروں اور دیہاتوں سے خبریں اکٹھی کر کے بادشاہی درباروں تک پہنچاتے تھے۔ برصغیر میں انگریزی، بنگالی، ملیالم، فارسی، ہندی اور اردو اخباروں کے اجرا کے ساتھ عام آدمیوں تک آسانی سے خبروں کی ترسیل ممکن ہوئی۔

کسی قوم کے کلچر کے فروغ میں ابلاغ عامہ کے ذرائع بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان کے وسیلے سے کسی قوم کے لوگوں کو اپنی ثقافت کا شعور حاصل ہوتا ہے۔انہیں ان منزلوں کی خبر بھی ملتی ہے جن تک پہنچنا قومی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔مغل ہندوستان میں درسی علوم، قلمی کتابوں، میلوں ٹھیلوں اور صوفی سنتوں کے حوالے سے ثقافتی حوالوں کی حد بندیاں کی جاتی تھیں۔وقائع نویسوں اور اعلان ناموں کے ذریعے لوگوں تک خبروں اور معلومات کو پہنچایا جاتا تھا۔مختلف السنہ میں موجود ثقافتی شعور مہد سے لحد تک ان کے کام آتا تھا۔مذہبی خطبے، شعر و ادب کی محفلیں، مکتوب نگاری اور داستان گوؤں کے مجمعے بھی خاص نوع کے شعور کو عام کرنے کا باعث تھے۔تاجروں کی مختلف ممالک میں آمد و رفت سے بھی بہت سی معلومات ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک منتقل ہوتی تھیں۔لیکن اس شعور کے پھیلاؤ کے مرکزی ذریعے نہ ہونے کے برابر تھے۔انگریز اپنے ساتھ نئی ایجادات اور نیا شعور لائے تھے۔ان کے وسیلے سے وہ کسی حد تک ترسیل معلومات میں سرعت رفتار ہو سکے تھے۔فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم واقعے کے بطور دیکھا جاتا ہے۔اس قبل علوم و فنون کے فروغ یا مذہبی تبلیغ کی سہولت کے لیے ہندوستان میں چھاپہ خانہ درآمد کیا جا چکا تھا۔ چھاپہ خانہ کے قیام سے ابلاغ عامہ کے پرانے ذرائع سے بڑی حد تک نجات ملنے کے اسباب پیدا ہوئے۔انگریزی علوم و فنون کی آمد سے اس معاشرے میں ایسی ہلچل پیدا ہوئی کہ آج تک ہم مغرب پر مستقل تنقید کیے چلے جا رہے ہیں۔شبلی نعمانی کا کہنا ہے:

> ''ترقی یافتہ قوموں میں تمام شریفانہ اخلاق کی زندہ رکھنے والی اور ابھارنے والی چیز پچھلوں کے جوش انگیز واقعات ہوتے ہیں۔ پارسیوں کا تمام لٹریچر مٹ گیا۔ان کی اصلی زبان کی دو کتابیں بھی آج نہیں ملتیں۔ ہزار برس سے بے خانماں ہیں لیکن صرف اس بات نے کہ ان کے نام بہمن، کاؤس اور کیقباد ہوتے ہیں آج تک ان کو زندہ رکھا ہے۔ یوروپ میں سینکڑوں ہزاروں اشخاص نام و نمود کے منبر پر نمایاں ہوتے ہیں اور صرف یہ بات ان کے حوصلوں اور ارادوں کو روز بڑھاتی اور تیز کر جاتی ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اخبارات اور تصنیفات کے ذریعے سے تمام عالم میں اس کی آواز پھیل جاتی ہے۔قوموں کا بننا، ابھرنا ان کے جذبات کا تازہ اور مشتعل ہوتے رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ ان کے اوصاف کی صحیح داد دی جائے

ان کے کارنامے نمایاں اور اجاگر کیے جائیں۔ ان کا ہر کام تاریخی صفحات پر چمکایا جائے۔ قصیدہ دراصل اسی کام کے انجام دینے کا ایک آلہ تھا‘‘۔[۳]

انشاء اللہ خاں انشا نے ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد منعقد ہونے والے جشن فتح کی مناسبت سے جارج سوم کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

بگھیاں نور کی تیار کرائے بوئے سمن　　کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن
عالم اطفال نباتات پہ ہوگا کچھ اور　　گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پاوڈر　　بیٹھ کر جلوے کی کرسی پہ دکھاوے گی پھبن
اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر　　غنچہ و گل سبھی واں کھولیں گے بوتل کے دہن
پتے ہل ہل کے بجاویں گے فرنگی طنبور　　لالہ لاوے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
آوے گا نذر کو شیشے کی گھڑی لے کے حباب　　یاسمیں پتوں کی پنیس میں چلے گی بن ٹھن[۴]

ان کے ایک اور قصیدے میں بھی انگریزی حوالے موجود ہیں:

نظر آئی مجھے کل باظفر و طوغ و علم　　صورتِ فتح مجسم ہو بہ شکل آدم
سر پہ اک خود دھرے جس پہ بڑی سی کلغی　　ڈھال کاندھے پہ پڑی ہاتھ میں شمشیر دودم
زرہ حسرتِ داؤد گلے میں اس کے　　جبروت اس کا فریدوں فر و جمشید شیم[۵]
ہیں سلامی کو کھڑے باندھ کے صف سب انگریز　　مارٹین اور برن، رول، ایمل آرنٹ[۶]

نشاۃ الثانیہ کا لفظ اب ہمارے لیے اجنبی نہیں رہا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب یورپ میں از سر نو علوم خصوصاً سائنسی تعلیمات پر توجہ دی جانے لگی۔ نئی ایجادات ہونے لگیں اور یوں وجود میں آنے والی نئی بحری اور بری ذرائع کے بل بوتے پر انگریزوں، ولندیزیوں، پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ہسپانیویوں نے اپنی سرحدوں کو عبور کرنا شروع کیا۔ واسکوڈے گاما نے ہندوستان کا رُخ کیا اور کئی دوسرے بحری اور بری طالع آزماؤں نے کئی دوسرے علاقوں کا۔ یوں سیاحوں اور جاسوسوں کی فراہم کردہ رپورٹوں کی روشنی میں جس نوع کی حکمت عملیاں بنائی گئیں۔ ان کے نتیجے میں یورپی یلغاروں کے لیے تمام دُنیا کے دروازے کھلنے لگے۔ نئی یورپی طاقتوں نے افریقہ، ایشیا، امریکہ اور لاطینی امریکہ کے کئی علاقوں کو اپنی اپنی سلطنتوں میں شامل کرنے کے سلسلے شروع کیے۔ دخانی انجن چھاپہ خانہ کی ایجاد اور کپڑا بننے، اسلحہ سازی، جہاز سازی کے کارخانوں نے ان طاقتوں کو حوصلہ دیا کہ وہ دُنیا کے مختلف علاقوں کو اپنی غلام منڈیوں میں تبدیل کر لیں۔ ادھر ایشیا، افریقہ اور امریکہ اور لاطینی امریکہ کے اصل باشندوں اور حکمرانوں نے ان بلیوں کو دیکھ کر کبوتروں کی طرح سے آنکھیں بند کر لیں۔ جہاں مقابلے کی صورت حال درپیش آئی وہاں مقامی، وزیروں، امیروں اور فوجی سرداروں کو زر خرید بنا کر فتوحات حاصل کیں۔ یورپی طاقتوں کے یہ طور طریقے ہمارے عہد میں بھی اسی طرح سے قائم ہیں۔ اُردو شاعر شیخ قلندر بخش جرأت کی یہ رباعی اسی حوالے سے لکھی گئی ہے:

کہیے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر

جو کچھ یہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر ے

غلام ہمدانی مصحفی نے لکھا کہ:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی۸

انگریز نفری میں کم تھے مگر انہوں نے محلاتی سازشوں اور ہندوستانی حکمرانوں کی باہمی چپقلشوں سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کو تاج برطانیہ کا مطیع بنالیا۔ بعدازاں انہوں نے اپنے نظام کے استحکام کے لیے یوں کام کیا کہ زوال پذیر قوم کا سونا بھی انہیں مٹی نظر آیا۔ اس سلسلے میں مستشرقین کی کتابوں نے مقامی کلچر اور عمومی طرز حیات پر بھر پور تنقید کی۔ مستشرق کا لفظ اس عالم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مشرق سے باہر رہتے ہوئے مشرقی علوم وفنون کے اکتساب اور تجزیئے کا کام کرتا ہے۔ یہ لوگ مشرقی فنون وادب کی اہمیت سے واقف ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے اوری اینٹالزم (مشرقیت) پر انتہائی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں مغرب کی اہم زبانوں میں موجود مشرق کے بارے میں معلوماتی اور علمی مواد کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ مشرقی امور پر مستشرقین نے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے توجہ دینی شروع کی۔ اس عمل میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔

ڈاکٹر ثوبیہ طاہر لکھتی ہیں:

> ''اورئینٹلزم (جس کا ترجمہ ہم نے علوم مشرق کے عنوان سے کیا ہے) میں انہوں نے مشرق کے متعلق مغرب کے مروجہ نظریات کا بھر پور مطالعہ کیا ہے اور نشاۃِ ثانیہ سے اب تک پیدا ہونے والے ادبی، بشریاتی، سماجی، سیاسی، تاریخی اور عمرانی علوم کا گہرا اور وسیع جائزہ لیا ہے۔ سعید نے اس کتاب پر مشرقِ قریب پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے اور اٹھارھویں صدی کے اواخر کو اپنا نقطۂ آغاز بنایا ہے۔ سعید نے اس کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ'' کاروباری اداروں میں علوم مشرق پر مباحثے اور تجزیے منعقد ہوتے رہتے ہیں تاکہ ان کی مدد سے مشرق سے معاملہ کیا جاسکے اور یہ معاملہ کیسے ہوگا؟ مشرق کے متعلق بیان جاری کرنے سے، اسے پڑھانے سے، سکھانے سے اور اس پر حکومت کرنے سے۔ مختصراً اورئینٹلزم مشرق کو غلام بنانے، اس کی تنظیمِ نو کرنے اور اس پر تسلط قائم کرنے کی ایک تکنیک ہے۔'' سعید کے اندر اس کام کے لیے گہری اہلیت پائی جاتی تھی۔ اورئینٹلزم طاقتور سیاسی جذبے اور بے پناہ علمیت کا امتزاج ہے۔''۹

نشاۃ الثانیہ کے زمانے میں دُنیا میں بڑی بڑی سلطنتیں موجود تھیں۔ ان میں سے چند سلطنتوں کے حکمران مسلمان تھے۔ اس دور میں چونکہ مغرب نے اپنے احیا کے لیے کمر باندھی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ مشرق پر بھی اس کی عملداریاں قائم ہوں اس لیے ابتدائی طور مشرقی طور طریقوں، رہن سہن کے وتیروں اور ثقافتی حوالوں کا کئی زاویوں سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ تجزیئے مطبوعہ کتابوں کے ذریعے دنیا بھر میں پھیلا دیئے گئے۔

مشرق نے جب مغرب سے درآمد شدہ علوم کی روشنی میں اپنے سفر کو طے کیا تو بقول صفدر میر:

''اس سارے عہد کی مختلف نئی نسلیں ایک ہی بھنور کے چکر میں پھنسی ہوئی ہیں۔ ان کے بظاہر نئے نظریئے ایک ہی نظریئے کے مختلف تناظر ہیں۔ نہ کوئی خالصتاً شاعری ہوتی ہے اور نہ کوئی خالصتاً خارجی شاعری۔ داخلی اور خارجی محض لفظی بحث ہے۔ یاسیت اور رجائیت میں کوئی بعد نہیں ہے۔ بنیادی نقطہ نظر سب جدید شاعروں کا ایک ہی ہے۔ بغاوت کلاسیکی اسلوب اور لغت سے بغاوت، ایک منفی نظام اخلاق سے بغاوت، ایک اکتا دینے والے معاشرتی اور مذہبی ماحول سے بغاوت، ایک بیرونی شہنشاہیت سے بغاوت۔ بعض شاعر اس بغاوت کے ایک حصے سے متعلق ہوئے۔ اور بعض دوسرے حصے سے لیکن کوئی بھی اپچ رکھنے والا شاعر اس سے بے تعلق نہ رہ سکا۔ کیونکہ اُردو زبان میں لکھنے والوں میں اس دور کی یہی روح زماں تھی۔ اُردو زبان میں لکھنے والوں کا جملہ میں نے شعوری طور پر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس سارے زمانے کا ہمارا ادب ایک مخصوص سماجی پس منظر سے منسلک ہے۔ اور ایک مخصوص سماجی طبقے کا ادب ہے سارے سماج کا ادب نہیں ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی زبان کے رواج نے پچھلے سو برس میں ایک اوپر کے ایسے طبقے کو جنم دیا ہے جس کا جذباتی اور فکری اظہار کا ذریعہ باقی ملک سے متعلق نہیں ہے۔ اُردو ادب اس طبقے کا ادب ہے نہ ہوسکتا ہے۔ جدید اردو ادب ہمارے یہاں متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقے کا ادب ہے۔ اس کے خالق بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے پڑھنے والے بھی۔ اس لحاظ سے یہ ادب قوم کے ایک حصے کے جذبات اور امنگوں کا عکس بنتا ہے۔ پوری قوم کا نہیں۔ اقبال کے بعد کے زمانے کا ادب اس متوسط طبقے کے رجحانات کا عکاس ہے۔''[۱۰]

ایڈورڈ سعید نے مغربی دانش کی پیدا کردہ صورت حال کو مغربی علوم کے فروغ اور مغربی دانش وروں کے مشرقی مطالعوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مستشرقین نے مشرقی ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، سیاست، لسانیات اور عمرانیات کے ہفت خواں اس لیے طے کیے تھے کہ انہیں مشرقی مسائل اور احوال کا ادراک ہو۔ انہوں نے مشرقی دُنیا کے حقائق اور تصورات کو سمجھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے وسیلے سے مشرق کو دریافت کیا اور خود مشرقی لوگوں کے سامنے ان کے علوم کو لا رکھا۔ اس دریافت کے عمل میں انہیں مشرقی تصورات اور خیالات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ یہ سب علوم چھاپہ خانہ کی ایجاد کی بدولت دُنیا بھر میں پھیلے۔ ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے:

''علوم مشرق جیسے مضامین کا اصل مقصد ایک پوری دنیا کو تسخیر کرنا ہے یا ایک دنیا کو پورا تسخیر کرنا ہے اور اس کے کچھ حصوں تک محدود رہنا نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے جہاں انہوں نے ''تاریخ''، ''ادب'' اور ''علوم انسانی'' جیسے کچھ حفاظتی غلاف بنا رکھے ہیں، وہیں کچھ ایسی درپردہ ٹیکنیکس بھی اختیار کر رکھی ہیں کہ علوم مشرق، ان کے عزائم کی تکمیل کے لئے سائنسی حقائق اور خود افروزیت سے عاری نظر آئیں۔ ایک ہم عصر دانشور مشرق سے متعلق علوم کی مدد سے ایک طرف ان علوم کی حدود یا پھیلاؤ کا حقیقی جائزہ لے سکتا ہے تو دوسری طرف وہ ان انسانی بنیادوں کو دیکھ سکتا ہے جن میں کتابیں، نظریے، طریقے، ذرائع، اندازِ فکر اور

علوم پیدا ہوتے، پلتے بڑھتے اور پھر ختم ہو جاتے ہیں۔ علوم مشرق میں تحقیق کرنے کا مطلب وہ نئے فکری طریقے وضع کرنا ہے جو ان نئے مسائل کو حل کر سکیں جو تاریخ اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔ خصوصاً اپنے ہی تناظر اور مضمون یعنی مشرق کے اندر۔''

اس پس منظر میں ایڈورڈ کا یہ بھی کہنا ہے کہ مشرقی علوم میں موجود معروضی اور سائنسی حوالوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مغربی ماس میڈیا نے مشرق کا جو غلط تصور پیش کیا ہے اس کو اصل متنی حوالوں سے درست بنیادیں فراہم کی جا سکیں۔ علاوہ ازیں مشرقی علوم میں موجود انسانی اقدار کا احیا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو مشرقی علم و ادب کی انسانی حوالوں اور قدروں کی حامل تحریروں کی اشاعت ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

حوالے:

۱۔ الف۔د۔نسیم، اقبال اور مسئلہ وحدت الوجود، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۵ء، ص: ۲۸
۲۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء، ص: ۳۱۶
۳۔ مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد پنجم، لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۲۹ء، ص: ۲۰، ۲۱
۴۔ ڈاکٹر سعادت سعید، اُردو قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ، قلمی، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۳۵۸
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً
۷۔ نشید حریت، محکمہ اطلاعات، حکومت پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۶۸، بحوالہ جرأت
۸۔ ایضاً، بحوالہ مصحفی
۹۔ ایڈورد سعید، بحران، مترجم ڈاکٹر ثوبیہ طاہر، تخلیق مکرر، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۸
۱۰۔ افتخار جالب، نئی شاعری، مضمون، بیابان جنوں از محمد صفدر، لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء، ص: ۹